جدیدیت: اسلام اور مغرب: دو مختلف مذاہب

جدیدیت کیا ہے؟ فلسفہ کی روشنی میں

مغرب جغرافیہ نہیں عقائد والٰہیات کا نام ہے:

مغربی تہذیب چند جغرافیائی حد بندیوں کی مرہون منت نہیں بلکہ کچھ خاص عقائد [مابعد الطبیعیات]، اقدار اور نظریات پر مبنی ایک مخصوص ذہنیت کی عکاس ہے۔ کسی بھی تہذیب میں انسان کا ایک خاص تصور اور مقام ہوتا ہے۔ اگر اس تصور انسان کو اپنا لیا جائے تو اس تہذیب کو [انہی] علمی بنیادوں پر رد کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ مغرب کی تہذیبی برتری اس کی فکری برتری میں پنہاں ہے۔ کسی بھی تہذیبی غلبہ میں گو کہ عسکری عنصر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، لیکن تاریخ شاہد ہے کہ محض عسکری بنیادوں پر حاصل کردہ غلبہ زیادہ دیرپا نہیں ہوتا ہے۔ کسی تہذیب کا زوال اس کی علمی بنیادوں کی شکست وریخت کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

مغربی تہذیب کی فکری بنیادوں سے عدم واقفیت کا خمیازہ ہم تین صورتوں میں بھگت رہے ہیں۔

[۱] مغربی فکری بنیادوں پر غلبہ اسلام کی کوششوں میں مصروف عمل انتہائی مخلص اور دیندار افراد اپنے مقاصد کے حصول میں شدید ناکامی سے دوچار ہوئے [اور مسلسل ناکام ہوتے جائیں گے۔ کیونکہ شیشم کے درخت سے آموں کے پھل کی توقع عبث ہے] اور بتدریج اپنے اسلامی تشخص سے محروم ہوتے چلے گئے۔

[۲] مغربی تہذیب کی فکر سے سطحی واقفیت رکھنے اور اس کی اساسی بنیادوں کو نہ جاننے کے باعث مغربی فکر کو ناقابل شکست تسلیم کر لیا گیا اور معذرت خواہانہ نقطہ نظر اختیار کر کے ہر مغربی خیال، نظریے اور ادارے کی اسلام کاری [Islamization] کی کوشش کی جاتی رہی۔

[۳] مغربی فکر کی شکست وریخت سے ناواقفیت کی بنا پر ہم میں سے اکثر دور تنویر [Enlightment era] کو اسلامی فکر کی ارتقائی شکل قرار دیتے ہیں اور مغرب کی مادی ترقی کو اسلامی فکر کی مرہون منت گردانتے ہیں۔ اس طبقے کے افراد دور حاضر میں بھی اٹھارویں، انیسویں صدی کی مغربی فکر کا راگ الاپ رہے ہیں اور اس علمی بحران سے بالکل ناآشنا ہیں جس کے باعث مغربی تہذیب اپنی فکری بنیادوں مثلاً اپنے مخصوص تصور انسان،

تصور خیر اور مقصد حیات وغیرہ کو عقلی بنیادوں پر ثابت کرنے کی کوششوں سے رجوع کر چکی ہیں۔

موجودہ حالات میں مغربی تہذیب کو فکری بنیادوں پر اکھاڑ پھینکنے کے امکانات جتنے آج موجود ہیں پہلے کبھی نہ تھے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ غلبۂ اسلام کی کوششوں میں مصروف عمل تمام قوتوں کو، خواہ وہ عسکری، معاشرتی، سماجی اور سیاسی نوعیت کی ہوں یا علمی فکری نوعیت کی، باہم ایک دوسرے سے مربوط کر کے ایک دھارے میں سمو دیا جائے اور کسی ایک کے کام کو کسی دوسرے کے کام سے برتر ثابت کرنے کی کوشش نہ کی جائے اور ہر کام کو غلبۂ اسلام کے ہمہ وقتی اور آفاقی کام کا حصہ اور جزو لاینفک سمجھا جائے۔

ہم ان فکری بنیادوں کی نشاندہی کرنے کی کوششیں کریں گے جو مغربی تہذیب کی علمی اساس قرار دی جاتی ہے تاکہ ان فکری بنیادوں کو ان کی روح اور تاریخیت کے ساتھ جان کر فکر اسلامی کو درپیش خطرات سے بچایا جاسکے اور احیاء اسلام کے عظیم کام کو آگے بڑھایا جائے۔

عیسائیت کی شکست وریخت: فقہ سے محرومی

مغربی تہذیب کا ارتقاء عیسائیت کی شکست وریخت کا نتیجہ ہے۔عیسائیت میں خدا اور بندے کے باہمی تعلق کے لیے احکام موجود تھے، لیکن بندے کے بندے سے تعلق کے لیے واضح احکام موجود نہ تھے۔یعنی عیسائیت فقہ سے محروم تھی، لہٰذا سماجی اور قانونی ڈھانچے کی تشکیل کے لیے جو قوانین مرتب کیے گئے۔وہ بنیادی طور پر رومی قوانین [جو کہ بنیادی طور پر سیکولر نوعیت کے تھے] سے اخذ کردہ تھے۔عیسائی فکر کی اسی بنیادی کمزوری کے باعث ریاست اور معاشرہ کے مابین تصادم اور علیحدگی کے عناصر ابتداء ہی سے موجود تھے اور آگے چل کر خود مخلص عیسائی مفکر آگسٹین نے City of man کو City of god سے الگ کر کے سیکولرازم کے لیے مضبوط جواز فراہم کر دیا۔شادی نہ کرنا، رہبانیت، عبادات میں غلو وغیرہ، جس کے باعث گرجا سے وابستہ لوگوں [مرد وعورت] کے عام معاشرے سے کٹ جانے کی مذہبی بنیادیں موجود تھیں۔اس غیر فطری طبقہ بندی کا نتیجہ طبقاتی کشمکش کی صورت میں برآمد ہوا اور عیسائی علماء نے مذہب کی من مانی تعبیر وتوضیح کے ذریعے عام فرد کو مذہب سے باغی کر دیا۔ عیسائیت میں کسی فقہی مکتب فکر کو برداشت نہیں کیا گیا۔زمین پر پوپ خدا کا نمائندہ تھا، وہ جسے جہنم کی وعید اور جنت کی بشارت دے دے آسمان پر بھی یہی فیصلہ برقرار رہے گا۔لہٰذا کیتھولک مکتب فکر سے اختلاف کرنے والے ہر مکتب فکر کو تہس نہس کر کے پاپائیت کو الوہیت کا درجہ دے دیا گیا۔کیتھولک چرچ کی اجارہ داری کا نتیجہ پروٹسٹنٹ ازم کی صورت میں برآمد ہوا۔

مارٹن لوتھر کی تحریک اصلاح: بنیادی نکات

لوتھر بذات خود ایک پادری تھا۔اس نے تحریک اصلاح کی بنیاد رکھی، جس کو بعد میں کیلون نے مزید تقویت بخشی۔پروٹسٹنٹ ازم کے بنیادی نکات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ ہر عیسائی کو بائبل کی تفسیر کرنے کا مکمل، یکساں اور مساوی حق حاصل ہے۔

۲۔خدااور بندے کا باہمی تعلق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دوسری آمد تک ختم ہو چکا ہے۔
۳۔کسی کو کسی کے معاشرتی مرتبے کے تعین کا کوئی مذہبی استحقاق حاصل نہیں۔
۴۔لہٰذا دنیوی کامیابی کو اخروی کامیابی کا پیش خیمہ سمجھا جائے جو دنیا میں مادی طور پر کامیاب ہے وہی آخرت میں بھی سرخرو ہے اسی لیے بادشاہ وقت ظل الٰہی ہے۔

ان اصولوں کی بنیاد پر جو اقداری اجزا معاشرتی طور پر ابھر کر سامنے آئے وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔آزادی[Freedom] ۲۔مساوات[Equality] ۳۔عقلیت[Rationality]

چونکہ ہر انسان یکساں طور پر عقل رکھتا ہے لہٰذا ہر ایک کو تفسیر انجیل کا مکمل یکساں اور مساوی حق حاصل ہوگا اور اخلاقی و روحانی تربیتی اقدار کا ٹھوڑا بہت اہتمام جو عیسائیت میں موجود تھا۔اس کا بھی جنازہ نکل گیا۔

مارٹن لوتھر: حاکمیت الٰہی سے حاکمیت جمہور تک

خدا سے تعلق ختم ہو جانے کے باعث معاشرتی مرتبوں کے تعین کی روحانی بنیادی ختم ہو گئیں اور اس کی جگہ مادی جاہ و حشمت قرب الٰہی کی نشانی سمجھا جانے لگا۔یہی وجہ ہے کہ پروٹسٹنٹ ازم میں پوپ کی قوت بھی بادشاہ کے پاس ہی ہوتی ہے۔اگر دنیاوی کامیابی ہی اخروی کامیابی کا پیش خیمہ ہے تو سب سے زیادہ کامیاب انسان بادشاہ ہی تو ہوا۔لہٰذا بادشاہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جو چاہنا چاہے وہ چاہ سکتا ہے کیونکہ وہ اس کا مقدس حق رکھتا ہے اور کسی کو اس حق کے انکار کا کوئی حق حاصل نہیں۔بادشاہ کا یہی مقدس حق ایک پروٹسٹنٹ ریاست کی ابتدائی شکل میں ریاستی، سماجی اور قانونی ڈھانچے کی تشکیل نو میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔آگے چل کر یہی مقدس حق کا تصور، مذہبی لبادے میں چھپے رومی اور یونانی سیکولر نظریات کے باعث ریاست کے مکمل طور سے سیکولرائز ہونے کا باعث بنا۔اسی مقدس حق کے تصور نے دنیا میں حاکمیت الٰہی کے دروازے بند کر دیے اور مسیحیت محض انفرادی حیثیت میں خدا سے ایک خالص تعلق رکھنے کی حد تک محدود ہو کر رہ گئی۔بعد میں یہی مقدس حق ایک فرد یعنی بادشاہ سے لے کر تمام شہریوں یعنی[Citizens] میں یکساں اور مساوی تقسیم کر دیا گیا۔پہلے حق و باطل، خیر و شر کے تعین کا مطلق حق صرف ایک فرد یعنی بادشاہ کو حاصل تھا مگر بعد میں یہی حق شہریوں کی رائے کی بنیاد پر جانچا جانے لگا، جس کی موجودہ شکل جمہوریت کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔

جدیدیت کی فلسفیانہ بنیادیں:

گو کہ پروٹسٹنٹ ازم نے فکر جدیدیت کی ٹھوس بنیادیں فراہم کر دی تھیں۔لیکن اس کے باوجود ہم پروٹسٹنٹ فکر کو جدیدیت سے دو بنیادوں پر ممیّز کر سکتے ہیں۔

۱۔ پروٹسٹنٹ ازم کا مطلق نصاب انجیل کی صورت میں موجود ہے۔جب کہ جدیدیت کا کوئی ایسا مطلق اور قطعی نصاب موجود نہیں۔

۲۔ پروٹسٹنٹ فکر میں آزادی کا محدود تصور خاص علمی بنیادوں پر ہے۔جب کہ جدیدیت آزادی کے

لامحدود تصور پر یقین رکھتی ہے۔

نصاب مطلق سے مراد یہ ہے کہ پروٹسٹنٹ فکر تفسیر انجیل کا حق ہر عیسائی کو دیتی ہے لیکن کسی بھی مصدقہ تفسیر کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ انجیل ہی سے کی جائے، لہٰذا کسی نہ کسی طور پر وحی کی حیثیت برقرار رہی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کوئی بھی پروٹسٹنٹ عقائد کا حامل فرد [خالص علمی بنیادوں پر] تفسیر انجیل کی بنیاد پر خدا کا انکار نہیں کرسکتا۔ یا مثال کے طور پر تفسیر انجیل کی بنیاد پر لواطت کو جائز قرار دینا آسان نہیں تھا۔ جب کہ جدیدیت کا کوئی نصاب مطلق موجود نہیں ہے لہٰذا فلاح انسانیت کی کوئی بھی تفسیر و تعبیر کی جاسکتی ہے، اگر کسی جدید مفکر کے کام میں خدا کے وجود کی عقلی دلیل موجود ہے تو کسی دوسرے فلسفی کے کام میں خدا کے انکار کا بھی عقلی جواز موجود ہوتا ہے۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پروٹسٹنٹ ازم گو کہ عیسائیت ہی کی بہت جدید شکل ہے لیکن اس کے باوجود اس میں مطلق آزادی کے حصول کے امکانات موجود نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جدیدیت کی تلوار کی کاٹ سے عیسائیت کی لبرل شاخ پروٹسٹنٹ بھی محفوظ نہ رہ سکی اور جدیدیت ایک لادینی تہذیب کے ارتقاء کا سبب بنی۔

جدیدیت کا بانی فلسفی: ڈیکارٹ

ڈیکارٹ [Descarter] کو ہم جدیدیت کی فکر کا بانی کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ اس نے جدیدیت کی علمیت کی حدود کا نہ صرف تعین کیا بلکہ بچی کھچی مذہبیت کو بھی علمی بنیادوں پر اکھاڑ پھینکا اور ایک نئے اقداری ڈھانچے کے لیے علمی بنیادیں فراہم کیں۔ ڈیکارت نے وجود انسان کے ادراک میں کسی بھی خارجی عامل کے کردار کو کلی طور پر رد کر دیا اور [Self knowledge] کی خالص عقلی دلیل دی اس کے مطابق علمی اور عقلی بنیادوں پر کوئی بھی انسان اپنے سوا کسی بھی چیز خواہ وہ خیالات ہوں یا اقدار، معیارات خیر و شر ہوں یا وحی، اور چاہے خدا کا وجود غرض کسی بھی چیز کا انکار کرسکتا ہے۔ اکیلی میری [عقل] ذات، میرا اپنا وجود ہے۔ جس کا ہونا کسی بھی قسم کے شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ ڈیکارٹ کے نزدیک واحد قائم بالذات سچ ''میں سوچتا ہوں، اس لیے میں ہوں، ہی ہے۔[I think there for I am] یعنی میں اپنے اسی دنیا میں ہونے کا جواز اپنے اندر رکھتا ہوں میرا وجود کسی خارجی ذریعے حقیقت مطلق یا خالق کائنات کا مرہون منت نہیں ہے۔ ڈیکارٹ کے مطابق میری عقل کی ''استطاعت'' نہیں'' کہ میرے اپنے وجود کے سوا کسی بھی دوسری ذات کے وجود کا ماورائے شک جواز پیش کرسکوں۔ اس طرح ڈیکارٹ نے ایک ایسی علمیت کی بنیاد رکھی جو کہ اولاً مابعد الطبیعیات [وحی] سے ماورا تھی اور دوم ریب [Doubt] پر قائم تھی۔ ڈیکارٹ کے بہ ظاہر معصوم جملے نے کہ میں سوچتا ہوں اس لیے میں ہوں اور میرا ہونا ہر قسم کے شک وشبہے سے بالا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ اعلان کر دیا کہ انسان کے سوا کائنات کے اندر اور کائنات سے باہر ہر وجود پر شک کیا جاسکتا ہے لہٰذا خالق کائنات کا وجود بھی شک وشبہے کی زد میں آ گیا۔

جدیدیت کو پہچاننے کے چار ذرائع:

یوں تو جدیدیت کی کوئی ایک تعریف موجود نہیں لیکن جدیدیت سے متعلق چند بنیادی نکات مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔انسان کائنات کا مرکز ومحور ہے۔[Anthropocentricity]

۲۔آزادی بنیادی آئیڈیل ہے۔[Fredom is Ideal]

۳۔مساوات بنیادی قدر ہے۔[Equality is value]

۴۔عقلیت بحیثیت معیار[Reason is the criterion]

جدیدیت نے چونکہ علمی بنیادوں پر صرف اور صرف وجود انسانی کو ہر شک وشبہے سے عاری پایا تھا۔ چنانچہ کائنات کو صرف اور صرف انسانی پیمانوں پر پرکھنا ہی علمیت کی میراث قرار پایا اور انسان پرستی [ہیومنزم] کو اقداری ڈھانچے میں کلیدی اور قطعی حیثیت حاصل ہوگئی۔دوسرے تمام جدیدیت پسند مفکرین کے یہاں اس بات پر اتفاق نظر آتا ہے کہ انسان آزاد تو ہے ہی، سوال یہ ہے کہ اس آزادی کے دائرہ کو کس طرح زیادہ سے زیادہ بڑھایا جائے۔اس طرح آزادی کی بڑھوتری ہی انسانیت کی معراج قرار پائی۔ چونکہ جدیدیت میں انسانی ذات کی اساس عقلیت میں پنہاں ہے لہٰذا ہر انسان برابر ہے اور عقلیت ہی خیر وشر کے پرکھنے کا واحد ذریعہ ہے۔

عقل کی بنیاد پر قطعی اور آفاقی سچ کا حصول ممکن ہے۔ جب انسان کو ہی تمام خیر وشر کے تعین کا حق حاصل ہے تو ایسی صورت میں خدا پرستی کا کیا سوال؟ حقیقتاً اگر دیکھا جائے تو جدیدیت نے خدا کی جگہ ایک ریشنل [عقل پرست] شخص کو بٹھا دیا۔دوسرے لفظوں میں خدا کی جگہ نفس پرستی نے لے لی جسے قرآن نے بدترین شرک سے تعبیر کیا ہے کیونکہ ہر شخص کی عقل نفس کے تابع ہے لہٰذا خواہش نفس ہی جدیدیت کا اِلٰہ ہے۔جدیدیت انسان کی الوہیت کا اعلان اور اعتراف ہے، زیادہ سے زیادہ سرمایہ کا حصول اور سرمایہ کا مسلسل ارتکاز اور بڑھوتری انسان کی الوہیت کا اظہار ہیں جدیدیت انسان کو خدا اور دنیا میں جنت بنانے کی ایک شعوری اور عملی کوشش ہے۔یہی وجہ ہے کہ جدیدیت کے کسی بھی مفکر کے کام کو اٹھا کر دیکھیں تو اس میں کہیں بھی کائنات کے دائمی ہونے کی نفی نہیں ملتی۔اگر اس دنیا کو کبھی فنا نہیں ہونا ہے تو پھر انسان کی زندگی کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ دنیا میں اپنے قیام کو طویل اور پر لطف بنانے کی کوشش کرے۔ ماڈرنسٹ علمیت [Modren Epistemology] جس کلمہ پر لوگوں کو جمع کر رہی ہے وہ انسان پرستی کے سوا اور کچھ نہیں کہ لا الہ الا انسان: یعنی کوئی معبود نہیں سوائے انسان کے، اس صورت میں خدا پرستی کا گمان خارج از امکان ہے۔ حادثاتی طور پر تو جدیدیت پسند معاشرے میں خدا پرستی ممکن ہے مگر اس کی کوئی علمی بنیاد پوری جدید فکر میں کہیں نہیں ملتی۔

انسان پرستی کی دو جدید شکلیں: آزادی کا اصل مطلب کیا ہے؟

مغربی فکر میں انسان پرستی کی بہت سی شکلیں موجود ہیں۔یہاں پر ہم صرف دو سے بحث کریں گے۔

۱۔لبرل ازم ۲۔کمیونیٹیرینزم

سولہویں صدی کے بعد یورپ میں دو ہمہ گیر تحاریک کو فروغ ملا۔ یہ دونوں تحریکیں تحریک تنویر اور تحریک رومانویت عیسائیت کو مکمل رد کرتی تھیں اور ایک نیا تصور انسان و کائنات اور نیا مقصد حیات پیش کرتی

تھیں۔ان دونوں تحریکوں نے انسانی ترقی کو اس بات پر منحصر قرار دیا کہ انسان کو کتنا آزاد ہونا چاہیے۔ان دونوں تحاریک[Enlightment & Romantic Movement] نے آزادی کو بنیادی قدر اور ہدف کی حیثیت سے قبول کیا۔آزادی سے مراد یہ ہے کہ انسان ہر وہ چیز حاصل کرنے کا مکلّف ہو جائے جس کی وہ خواہش کرتا ہو اور بحیثیت انسان اس کی اس حیثیت کو تسلیم کیا جائے کہ وہ خیر وشر کے معیارات خود متعین کرنے کا اہل ہے۔

آزادی اصل مطلوب مقصود منزل ہدف ہے:

انسان حصول لذت میں کسی پابندی کا پابند نہیں:

کمیونیٹیرین ازم اور لبرل ازم دراصل اینلائٹمنٹ اور رومانویت کی تحاریک کے جانشین نظریات ہیں۔لبرل ازم اور کمیونیٹیرین ازم میں اہم ترین قدر مشترک یہ ہے کہ دونوں آزادی کو افضل ترین مقصود کے طور پر تسلیم کرتے ہیں۔دونوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ کسی بھی معاشرے کے قیام اور وجود کا اہم ترین کلیدی مقصد حصول آزادی ہے۔آزادی دراصل مقصود بالذات ہے نہ کہ خدا پرستی اور رضائے الٰہی کا حصول۔دونوں نظریات آزادی سے یہی مراد لیتے ہیں کہ انسان جو چاہے وہ حاصل کر سکے اور حصول لذات کی راہ میں مادی اور معاشرتی قیود یکسر ختم ہو جائیں۔

لبرل ازم کا فروغ ۱۶ویں صدی سے ہونا شروع ہوا اور اس کا غلبہ انقلاب فرانس کے بعد تمام مغرب پر قائم ہوا۔

لبرل ازم[Libralism] کا دعویٰ تھا کہ جب عیسائی مذہبی اقدار کی معاشرتی گرفت کمزور ہوگی اور معاشرے کی ترتیب عقلی اور سیاسی بنیادوں پر کی جائے گی تو حصول آزادی کا ہدف آسان سے آسان تر ہوتا جائے گا اور ہر شخص اپنی انفرادی حیثیت میں اپنے خیر وشر کے معیارات کا تعین کر سکنے کے ساتھ ساتھ اپنی خواہشات بآسانی پورا کر سکے گا۔کمیونیٹیرینز[communitarianism] کے نزدیک افراد خیر وشر کے معیارات کا تعین اپنے اغراض ومیلانات کی بنیاد پر کرنے کے مکلّف نہیں۔بلکہ خیر وشر کے معیارات کا تعین نوع انسانی کی مجموعی انسانی دنیاوی اغراض کو سامنے رکھ کر کرنا چاہیے۔اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ لبرل ازم میں فرد اپنی الوہیت کے اظہار کا تنہا مکلّف ہے، جب کہ کمیونیٹیرین ازم کی فکر میں انسان بحیثیت نوع کے کلاس یا قوم ونسل کے ذریعے اپنی الوہیت کے اظہار کا حق رکھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ قوم پرستی اور سوشل ازم کمیونیٹیرینزم ہی کی توسیع کا نام [Extention] ہیں۔

گو کہ لبرل ازم کمیونیٹیرینزم فکر میں آزادی بنیادی قدر ہے اور دونوں ہی فکریں بنیادی طور پر انسان پرست[Humanist] ہیں۔لیکن لبرل اور کمیونیٹیرین آزادی کے مختلف تصورات پر یقین رکھتے ہیں۔اس فرق کو نہ سمجھنے کی بنیاد پر بہت سی خالص مذہبی تحریکیں سوشل ازم اور قوم پرستی کا شکار ہوتی نظر آتی ہیں۔

آزادی کیا ہے؟[What is Freedom?]

آزادی سے مراد ہے کہ انسان اپنے خیر وشر کے معیارات کے تعین کا نہ صرف خود مجاز بلکہ حق دار ہے

اوراس کی انسانیت کا جوہر روح[Sprit] ہی یہ ہے کہ وہ اپنی آزادانہ متعین کردہ اقدار کو اپنا سکے اوران کے مطابق اپنی زندگی گزار سکے۔ وہ کسی خارجی ذریعے[External source] سے اپنی خواہشات کے تعین وترتیب کا پابند نہ ہو، بلکہ خواہشات کا منبع اس کا نفس ہو۔

کانٹ کا تصورانسان:[End in himself]

اس کا بہترین اظہار ہمیں مغربی مفکر کانٹ[Kant] کے یہاں ملتا ہے جو انسان کو مقصود بالذات [End in Himself] قرار دیتا ہے وہ ایک جگہ کہتا ہے کوئی بھی کام یہ سوچ کر نہ کرو کہ تم ذریعہ ہو بلکہ ہر کام یہ سوچ کر کرو کہ تم ہر چیز کا مقصد ہو۔

مغربی مفکرین نے آزادی کی دو اقسام بیان کی ہیں:[۱] آزادی کا منفی تصور[۲] آزادی کا مثبت تصور

آزادی کا منفی تصور[Negative Concept of Freedom]:

آزادی کا منفی تصور یہ ہے کہ معاشرہ جو ناگزیر پابندیاں لگاتا ہے اس کے باوجود انسان کے پاس ایک ایسا علاقہ بچ رہنا چاہیے جس میں وہ اپنی خدائی کا اظہار کرنے کے لامحدود مواقع رکھتا ہو اور اپنے متعین کردہ اصولوں کے مطابق زندگی گزار سکے۔ آزادی کے منفی تصور میں اس بات سے بحث نہیں کی جاتی کہ انسان اس دائرہ کار میں کس قسم کی زندگی گزارے گا؟ بلکہ یہ تصور صرف اس بات پر زور دیتا ہے کہ معاشرتی اور ریاستی جکڑ بندیوں کے درمیان ایک ایسا علاقہ ضرور بچ رہنا چاہیے جس میں انسان جو چاہنا چاہے وہ چاہ سکے اور کر بھی گزرے اور اس معاملے میں کسی کے سامنے جواب دہ نہ ہو۔ وہ اس علاقے میں چاہے کچھ بھی کرے یہ وہ مقدس حق [Divine right] ہے جس کے اندر کوئی مداخلت نہیں کرسکتا۔ یاد رہے کہ اس مقدس حق کی مذہبی بنیاد ہمیں مسیحیت کے پروٹسٹنٹ دھڑے میں واضح طور پر ملتی ہے جس کا ذکر ہم اوپر کرآئے ہیں۔ انفرادی حقوق کا سارا معاملہ اس مقدس حق آزادی کا تحفظ ہے جس میں آزادی فکر ونظر، حق ملکیت، اظہار رائے وغیرہ شامل ہیں۔ آزادی کے اس تصور کے نتیجے میں پبلک[Public] اور پرائیویٹ[Private life] زندگی کا فرق پیدا ہوتا ہے۔ یعنی اس تصور کے مطابق فرد اپنی نجی زندگی میں کسی کو بھی مداخلت کا حق نہیں دیتا۔[نجی زندگی سے مراد صرف فرد کی ذات ہے، اس کی بیوی بچے اس نجی زندگی کا حصہ نہیں ہیں، اگر وہ ان میں سے کسی پر اپنے نظریات نافذ کرنے کی کوشش کرے گا تو یہ Public life میں مداخلت سمجھی جائے گی، اسی لیے اگر مغرب میں مرد خراٹے لے تو عورت مقدمہ کردیتی ہے، باپ بچے کو گھر سے نکلنے سے منع کرے تو بچہ پولیس کو طلب کرلیتا ہے کہ میری نجی زندگی میں مداخلت ہے، ساحل] مقصود یہی ہے کہ فرد کی آزادی زیادہ سے زیادہ ممکنہ حد تک وسیع ہوتی چلے جائے۔ تاکہ اس کی خدائی میں اضافہ ہوسکے۔ منفی تصور آزادی سے اخذ کردہ چند اہم نتائج مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ اس بحث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آزادی درحقیقت کچھ نہیں، یہ صرف وہ علاقہ ہے جہاں انسان جو کچھ چاہے کرگزرے۔ خود آزادی کچھ نہیں ہے۔ اس کی کوئی اصل[Content] نہیں ہے۔ بلکہ اس کی

اصل[Content] نفسانیت یا نفسانی خواہشات کی خانہ پری کا نام ہے۔

۲۔آزادی اقدار کی نفی ہے، کیونکہ جب آپ کہیں گے کہ آزادی ایک ایسا علاقہ ہے کہ جہاں آپ جو چاہیں چاہ سکیں اور کر بھی گزریں اور جو آپ کر گزریں وہی حق ہے۔تو اقدار کی بحث ہی بے معنی ہو جاتی ہے۔ہر شخص قدر خود متعین کرتا ہے۔حالانکہ قدر[Value] کی تعریف ہی یہ ہے کہ اس کا پیمانہ انسان کی ذات نہیں بلکہ خارجی[External] اور معروضی[Objective] ہو۔اگر ہر شے اور خواہش کی قدر یکساں ہے تو فی الحقیقت کسی شے کی کوئی قدر نہیں۔اس لغو بے بنیاد تصور کے نتیجے میں خیر و شر حق و باطل سب بے معنی ہو جاتے ہیں، جب تمام اقدار یکساں ہوں تو اصلاً کوئی قدر، حق، خیر باقی ہی نہیں رہتا۔

۳۔آزادی کے منفی تصور سے متصل تصور اقدار کے تعدد یعنی[Plurality of values] کا ہے۔ یعنی میری متعین کردہ قدر کسی بھی متعین کردہ قدر کے برابر ہے۔اس سے یہ بات واضح طور پر نکلتی ہے کہ ترتیب اقدار ناممکن ہے کیونکہ ہر شخص کی متعین کردہ اقدار یکساں اہمیت کی حامل ہیں۔اقدار کی فوقیت صرف ارتکاز قوت [کثرت رائے یا کثرت مال] سے قائم کی جا سکتی ہے اور اس فوقیت کا کوئی نظری جواز پیش نہیں کیا جا سکتا اور سب سے اہم مقدس حق کا یہ تصور عیسائیت کی مارٹن لوتھر کی تحریک اصلاح کی مسخ شدہ شکل سے اخذ کردہ ہے۔

آزادی کا مثبت تصور:

لبرل ازم کے برعکس کمیونیٹیرین ازم آزادی کا ایک مثبت تصور پیش کرتے ہیں۔ان کے خیال میں عقل ہمیں بتا سکتی ہے کہ آزاد ہونے کا کیا طریقہ ہے اس سلسلے میں روسو، ہیگل اور مارکس نے مثبت آزادی کے مختلف تصورات بیان کیے ہیں اس تصور آزادی کا حصول ایسے معاشرتی نظام میں ممکن ہے جس کے نتیجے میں انسانیت بحیثیت نوع کے خدا بن سکے۔اس تصور میں آزادی کا اظہار انفرادی حیثیت کے بجائے افراد بحیثیت نوع یا قوم یا کلاس کے اجتماعیت میں کرتے ہیں۔اس تصور آزادی کے حصول کے لیے لازماً فرد کو اپنی انفرادی آزادی اجتماعی آزادی کے حصول کے لیے قربان کرنا پڑتی ہے جس کے باعث اظہار آزادی کے ذریعے انسانیت بحیثیت نوع کے اپنی الوہیت کا ادراک کرنے کے قابل ہو سکتی ہے۔روسو کے نزدیک ایک معاہدہ عمرانی کے ذریعے ایک ایسے انقلابی معاشرے کے قیام کا امکان موجود ہے جس کے ذریعے آزادی کا حصول ممکن ہے۔مارکس کے مطابق طبقاتی کشمکش کے ذریعے انسانیت بحیثیت نوع کے خدا بن سکتی ہے۔کمیونیٹیرین ازم جس تعقل کو بنیاد بنا کر مثبت آزادی کو متشکل کرنے کا دعویدار ہے وہ بھی خواہشات کی غلام ہے۔یعنی [Rationality bounded by desires] ہے اور اقدار کی آفاقی اور مستقل ترتیب کرنے سے قاصر ہے۔اس تصور آزادی کو کمیونیٹیرین ازم [Communitarianism] کی مختلف شکلوں [Forums] میں الگ الگ طرح سے آشکار [Realize] کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔مگر ہم یہاں صرف دو اقسام [Forms] سے بحث کریں گے۔[جو آگے کے ابواب میں ممکن ہے اپنے مفکرین کی علمی کمزوریوں کو سمجھنے میں مدد دے سکے]۔

جدیدیت کی دو شکلیں:

اشراکیت[Socialism]،قوم پرستی[Nationalism]

اشتراکی نظریہ کے مطابق پرولتاری یعنی مزدور طبقہ واحد آفاقی طبقہ ہے اور اس کے اغراض اور مفادات انسانیت کے اصل اغراض و مقاصد ہیں۔لہٰذا معیارات خیر وشر کو پرولتاری طبقہ کے اغراض کی بنیاد پر متعین کرنا چاہیے۔اس طرح نوع انسانی کی مجموعی آزادی میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہوسکتا ہے۔

قوم پرستی جزوی طور پر اس بات کا موقع فراہم کرتی ہے کہ لوگ اپنے اعلیٰ وارفع جذبات کا اظہار اجتماعیت میں کریں قوم پرستی کی دو بنیادی اقسام[Forms] ہیں:

۱۔[Civil grounded nationalism] جس میں تمام افراد کسی خاص مملکت کے شہری ہونے کی بنیاد پر ایک ہی [قوم] اکائی کا حصہ تصور کیے جاتے ہیں اور اس اشتراک عمل کا ہدف اور مقصد قوم کی اجتماعی آزادی کی بڑھوتری اور زیادہ سے زیادہ مادی وسائل وقوت کا ارتکاز ہے۔

۲۔[Ethical / Racial grounded nationalism] کے تصور میں تمام افراد ایک نسل سے تعلق رکھنے کی بنیاد پر ایک اکائی کا حصہ تصور کیے جاتے ہیں،لیکن مقاصد کے حوالے سے دونوں تصور قوم پرستی ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔

مغربی قوم پرستی اور مسلم قوم پرستی!ایک سکے کے دو رخ:

قوم پرست نظریے میں بظاہر دنیاوی روحانیت کا عنصر اسلامی انقلابیوں کے لیے خاصا پرکشش ہے۔ چونکہ قوم پرستی بظاہر یہ موقع فراہم کرتی ہے کہ لوگ اپنے انفرادی مفادات کو قومی مفادات پر قربان کرنے کے لیے تیار ہوجائیں اس لیے قوم پرستی کی بنیاد پر افراد اپنے اعلیٰ وارفع جذبات کا اظہار کریں لیکن چونکہ قوم پرستی کی جڑ بنیادی طور پر ابلیسیت پر قائم ہے لہٰذا ان جذبوں کا اظہار اپنی قوم کے لیے محبت،ایثار،قربانی اور غیر قوموں کے لیے نفرت کی صورت میں نکلتا ہے ان معنوں میں قوم پرستی قلب کی بیماری ہے،جس میں افراد کے کسی ایک مجموعے کو اپنا اور کسی دوسرے مجموعے کو غیر تصور کرنے لگتے ہیں اور اپنے افراد یا قوم کے لیے وہ اس پریشانی کا شکار رہتے ہیں کہ ان کی قوم کا جو مقام ہے وہ اسے حاصل نہیں ہے اس لیے قوم کو اس کے اعلیٰ مقام تک صرف ایک چیز پہنچا سکتی ہے اور وہ ہے قوت۔اس لیے ہر قوم پرست کا مقصد اور ہدف اپنی قوم کے لیے قوت میں اضافہ ہوتا ہے اور قوت کا یہ اضافہ پیمانہ معیار خیر وشر بن جاتا ہے اور افراد کے اندر اس قسم کے جذبات پروان چڑھتے ہیں کہ وہ چیز حق ہے جو سندھی،مہاجر،پٹھان،پنجابی،جرمن یا امریکی قوم کی قوت میں اضافہ کا باعث ہو ہر وہ چیز حق ہے جو پاکستان کی قوت میں اضافہ کا باعث ہو اسی خیال کو اگر مزید پھیلا کر دیکھا جائے تو ہر وہ چیز حق ہے جو مسلمانوں کی قوت میں اضافہ کا باعث ہو اور ہر وہ چیز باطل ہوجاتی ہے جو ایک قوم کی قوت میں کمی کا باعث بنے چاہے وہ چیز حق کے مسلمہ اصولوں پر کتنی ہی پوری کیوں نہ اترتی ہو چنانچہ اس طرح اخلاق ایک اضافی چیز بن کر رہ جاتا ہے اور دینی معیارات

کی حیثیت ختم ہوجاتی ہے۔ دینی معیارات تو وحی کے ذریعے قائم کیے جاتے ہیں یعنی ان معیارات کو تخلیق کرنے میں انسانی عقل کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ لیکن اب چونکہ قوت کا اضافہ اور کمی خیر وشر کا معیار قرار پاتے ہیں لہٰذا قوم کے افراد وہ معیار خیر وشر وضع کرتے ہیں جو لازماً ان کے خود سے محبت [self love] کا مظہر ہوں۔ اس طرح جو بھی معیارات بنائے جائیں گے وہ بنیادی طور پر نفسانیت ہی کی بنیاد پر ہی بنائے جائیں گے۔ گویا قوم پرست کے دل میں نفس کی پرستش، لالچ، حسد اور نفرت ڈیرا ڈال لیتی ہے۔ نفرت کے اس منفی جذبہ اور قوم سے محبت کے حوالے سے قوم پرست یہ بھی سوچتا ہے کہ اگر اس کی لذت کی خواہش قوم کی قوت کے حصول کی راہ میں رکاوٹ بن رہی ہے تو وہ اپنی اس خواہش کو ترک کر دیتا ہے۔ حتیٰ کہ قوت میں اضافے کے لیے اس کی جان بھی چلی جائے تو اس سے دریغ نہیں کرتا حالانکہ اس مقصد کے حصول میں غیر پر ظلم کرنا حق سمجھتا ہے کیونکہ اس طرح غیر کی قوت میں کمی واقع ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ تمام قوم پرست تنظیمیں متشدد ہوتی ہیں۔ قوت کی پرستش کرنے والا مسلم قوم پرست دعوت کے فریضے کو سرانجام نہیں دے سکتا۔ کیونکہ دعوت کا مطلب غیر کو اپنانا ہے اور اگر مطمح نظر غیر سے نفرت ہو تو اس کے خلاف سازش کرنا، اس سے حسد کرنا جائز ہوا تو لازماً اس کو اسلام کی دعوت موثر طور پر نہیں دی جاسکتی۔ اسی طرح گو کہ ایک مسلم قوم پرست مسلم قوم کی قوت کے حصول کے لیے کوشاں ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود ہم کہہ سکتے ہیں کہ قوم پرستی کی کوئی بھی شکل اسلام کی دعوت کے آفاقی ہونے کی نفی کرتی ہے۔ ایک قوم پرست اپنے ملی تشخص کے ادراک کے لیے دوسری قوم کے وجود کو قابل جواز [Legitimate] قرار دیتا ہے اور ہمیشہ اس Paradoxical co-exitance کا شکار رہتا ہے۔ ایک قوم پرست کے پاس کوئی آفاقی دعوت نہیں ہوتی اور اپنے تشخص کی کلچرل، نسلی اور تاریخی بنیادوں پر متمیز کرنے کے سوا اس کے پاس کوئی اور دوسرا ذریعہ نہیں ہوتا ہے۔ ہماری دعوت کا ہدف لوگوں کو اللہ کی طرف بلانا اور جہنم سے بچانا ہے مسلمان قوم کی قوت میں اضافہ ہمارا بنیادی مقصد نہیں ہے۔ ہم مسلم قوم پرست نہیں ہیں اگر مسلم قوم پرستی کے نتیجہ میں پاکستانی معیشت سوئیڈن جیسی بن گئی لیکن تمام لوگ جہنم کے حقدار ہو گئے تو یہ صریح ناکامی ہوگی۔ دنیاداری، جاہ وحشمت اور رضائے الٰہی میں کوئی لازمی تعلق نہیں ہے لہٰذا ایک اسلامی انقلابی کو مسلم قوم پرستی سے محفوظ رکھنا ہمارا فرض ہے۔

اسلامی قوم پرستی آفاقیت کی نفی ہے:

دعوت اسلام ایک آفاقی تاریخ میں شامل ہوجانے کا نام ہے، جو انبیاء علیہم السلام کی دعوت کے نتیجے میں تشکیل پائی ہے۔ لیکن اسلام نہ تو کوئی تاریخی طور پر مخصوص [Historically Specific] کسی خیر رسیچ کی طرف لوگوں کو بلا رہا ہے اور نہ ہی اسلام مسلمانوں کی جاہ وحشمت کا قیام چاہتا ہے بلکہ اسلام کا صرف ایک مقصود ہے اور وہ ہے رضائے الٰہی کا حصول۔ دعوت کی بنیاد محبت ہے داعی کا کوئی غیر نہیں ہوتا، وہ ہر شخص کا خیر خواہ ہوتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد قریش کے ساتھ جو حسن سلوک کیا وہ ایک انقلابی اور ایک قوم پرست کی قلبی کیفیت کے بنیادی فرق کو واضح کرتا ہے۔ احیائے اسلام کی کوششوں میں مصروف عمل جہادی

تحریکوں سے وابستہ پرخلوص نوجوان کارکنوں کوقوم پرستی کی زہرناکی سے بچانا ہم سب کا اہم ترین فریضہ ہے۔قوم پرستی میں صرف وہ اقدار فوقیت رکھتی ہیں جوقوت میں اضافے کا باعث ہوں اوران اقدار کوناپسند کیا جاتا ہے جو قوت میں کمی کا باعث بنیں اس طرح معاشرے میں وہ افراد ہی بہتر خیال کیے جاتے ہیں جن کی قوت زیادہ ہواور وہ اپنی قوم کے لیے زیادہ سے زیادہ قوت جمع کرسکیں اس طرح قوم پرستی کے شخصیت پرستی میں مدغم ہوجانے کے امکانات بڑھتے چلے جاتے ہیں اور یہ قومی ہیروز اپنی قوم کو طاقتور بنانے کے لیے مذہب، اخلاقیات، انسانی جذبوں اورلطیف رویوں کوروندتا ہوا ناپائیدار قوت کے زیادہ سے زیادہ ارتکاز میں سرگرم عمل ہوجاتا ہے جو یقیناً احیائے اسلام کی کوششوں میں مصروف قوتوں کے لیے زہرقاتل کا کام کرتا ہے۔

سرمایہ داری لبرل ازم کمیونی ٹیرن ازم سوشلزم کا ہدف: خواہش نفس الٰہ ہے

سب سے پہلی بات جس کا ادراک نہایت ضروری ہے وہ یہ کہ خواہ لبرل ازم ہو یا کمیونیٹرین ازم کی کوئی بھی صورت [قوم پرستی خواہ سوشل ازم] ان کا ہدف ایک ہی ہے،یعنی حصول آزادی، گویا ہر فرد کواس قابل بنانا کہ وہ جو چاہے وہ چاہ سکے اوراسے حاصل بھی کرسکے۔ بظاہر اشتراکیت لبرل ازم پر یہ الزام لگاتی ہے کہ افراد کی آزادی کا حصول انفرادی ملکیت اور سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں ممکن نہیں۔لیکن روس میں پچھتر سالہ اشتراکی تجربہ نے ثابت کردیا کہ وسائل کوقومی ملکیت میں لے کربھی آزادی کا یہ ہدف حاصل نہ کیا جاسکا۔روس کے عوام کی ایک بڑی اکثرت نے اشتراکیت سے برأت کا اعلان کرکے اس بات کا ثبوت دیا کہ وہ سرمایہ دارانہ لبرل ازم کوحصول آزادی کا بہتر طریقہ سمجھتے ہیں اورروس میں اس کے احیاء کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے کوتیار ہیں۔یہاں سے ہم انسانیت پرستی، لبرلزم اور سرمایہ داری میں ایک قدر مشترک پاتے ہیں، اور یہ تینوں نظریات ایک دوسرے کی معاونت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔لہٰذا وہ اسلامی انقلابی نوجوان جوان تینوں نظریات کو[علیحدہ علیحدہ رکھ کر] جاننے کی کوشش کرتے ہیں وہ اس فطری تعلق کونظرانداز کر بیٹھتے ہیں جومغربی تہذیب کی اساس کا درجہ رکھتا ہے یعنی ''آزادی''۔

انسان پرستی: الوہیت انسانی

آزادی کی شکلیں: سرمایہ ووٹ

مغربی تہذیب کی بنیاد انسان پرستی پر ہے یعنی انسان خود مقصود ہے اوراس دنیا میں اس کی آمد کا مقصد زیادہ سے زیادہ لذت اوراپنی خواہشات کی تکمیل ہے۔مغرب اس بات پر یکسو ہے کہ انسان پرستی صرف آزادی کے حصول کے بعد ہی ممکن ہے۔گویا دنیا میں کامیابی کے لیے آزادی کا حصول لازمی قرار پاتا ہے۔یہی وہ قدر ہے جسے حاصل کرکے انسان انسان بن جاتا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ آزادی بذات خود کچھ نہیں ہے۔اس کی Concrete form سرمایہ ہے اوراس کی مجرد شکل ووٹ ہے،لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ کمیونیٹرین ازم [communitarianism] بھی Humanism کی ایک شکل ہے۔تاہم انسانیت پرستی کے لیے پھلنے پھولنے کے امکانات ایک لبرل معاشرے میں کہیں زیادہ ہیں۔اس لیے کہ ایک لبرل معاشرہ میں سرمائے کی بڑھوتری کے امکانات اشتراکی

معاشرے سے کہیں زیادہ ہیں اور سرمایہ کی بڑھوتری دراصل آزادی کی بڑھوتری کا ہی دوسرا نام ہے۔

لبرل معاشرے میں وہ انسان نہیں کہلاتا جو.....

لبرلزم میں جیسا کہ پہلے بیان کا جا چکا ہے کہ فرد بحیثیت فرد کے مقصود ٹھہرتا ہے، اگر انسان اپنی آزادی کا شعور حاصل کر لینے کے بعد اپنی انفرادی آزادی کو کسی شے پر قربان کر دے تو لبرل معاشرے کی نگاہ میں وہ انسان ہی نہیں رہتا۔ لہٰذا انسان کی انسانیت اس کی آزادی میں پنہاں ہے۔ اب اس آزادی کے حصول کی دو معاشرتی صورتیں ہیں۔

حصول آزادی کی دو صورتیں:

۱۔ افادیت پسندی [Utilitarianism] ۲۔ رالسی نظریہ [Rawlsianism]

افادیت پسندی کے نظریے میں معاشرے کی مجموعی فلاح کے نام پر لبرل اقدار کا تحفظ کیا جاتا ہے۔ یہ انسان کی آزادی کے قائل ہیں لیکن اس کے نتیجے میں مجموعی فلاح کی بڑھوتری ضروری ہے۔ افادیت پسندوں کے مطابق ایک ایسے معاشرے کی تشکیل ممکن ہے جس میں زیادہ سے زیادہ لوگ زیادہ سے زیادہ لذت حاصل کر سکتے ہیں لیکن اس کے نتیجے میں کم لوگوں کی افادیت اور حقوق قربان کیا جانا جائز ہے یعنی اگر کسی عمل کے ذریعے زیادہ لوگوں کو فلاح حاصل ہو رہی ہو تو جائز ہے ورنہ ناجائز۔ یعنی ایسے معاشرے میں شراب کے ناجائز ہونے کی صرف ایک صورت ہو سکتی ہے کہ اس سے لوگوں کی صحت خراب ہو رہی ہو اور وہ دنیا میں زیادہ لذت کے حصول سے محروم ہو رہے ہوں۔

رالسی نظریہ افادیت پسندی کا جزوی رد ہے۔ رالس کے مطابق افادیت پسند معاشرے کو ایک فرد کی حیثیت سے دیکھتا ہے جس کے نتیجے میں افادیت پسندی انسان کی آزادی پر حد لگا کر اسے محض لذات کے حصول کا ذریعہ بنا دیتی ہے جس کے باعث وہ اپنی انسانیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ رالس لبرل معاشرے کا جو تصوراتی خاکہ پیش کرتا ہے وہ خود غرض [Self intersted] افراد کا ایسا گروہ ہے جو باہمی رضامندی سے ایک ایسا سماجی معاہدہ ترتیب دیتا ہے جس کی بنیاد عدل کے ان دو اصولوں پر قائم ہے۔

۱۔ ہر فرد کو اپنے مفادات کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کے لیے ممکنہ حد تک آزادی مہیا کی جائے۔

۲۔ معاشرے کے پسماندہ ترین گروہ کے مفادات کو حتی الوسع فروغ دیا جائے۔

رالس: قدر مطلق کے چار عوامل: آزادی صرف چار چیزوں کا نام ہے

رالس کے مطابق ان مفادات کے حصول چند ابتدائی خیر میں پنہاں ہے اور یہ بنیادی ابتدائی خیر حسب ذیل ہے:

۱۔ دولت [Wealth]، ۲۔ آمدنی [Income]، قوت [Power]، ۴۔ اختیار [Authority]

رالس کے مطابق یہی چار اشیاء قدر مطلق کی حامل ہیں اور ان میں اضافہ دراصل آزادی میں

اضافے کا مماثل ہے۔ چونکہ بنیادی آزادی کے اظہار کے لیے یہ چار عوامل نہایت ضروری ہیں اس لیے دوسرے لفظوں میں ایک لبرل معاشرے میں آزادی ان اشیاء کی بڑھوتری کا ہی نام ہے لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ لبرل یا مغربی تصور آزادی خالص مادی نوعیت کا ہے اور اس تصور کے عام ہونے کا مطلب مذہبیت، روحانیت، عقیدۂ آخرت، احیاءِ دین اور حصول رضائے الٰہی کی کے خاتمے کے سوا کچھ اور ممکن نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کہتے ہیں رالس مفادات کا خالص مادہ پرستانہ تصور پیش کرتا ہے جس میں افراد کی آزادی کی بڑھوتری کا انحصار مجموعی قومی پیداوار میں اضافہ پر مبنی ہے۔ لہٰذا قومی پیداوار میں اضافہ ایک ایسا آفاقی ہدف قرار پاتا ہے جس کو قبول کرنے پر ہر شخص کی خود غرضی اسے اکساتی ہے چنانچہ لبرل معاشرہ پیداوار کو زیادہ سے زیادہ فروغ دینے کی کوشش کرتا ہے اور اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ یہ پیداواری تری فروغ خود غرضی کے بغیر ممکن نہیں گو کہ اس خود غرضی کو فروغ دینے کے نتیجے میں دولت قوت وغیرہ کی تقسیم لامحالہ غیر منصفانہ ہوتی ہے۔ چنانچہ ان اسلامی انقلابیوں کو جو بہبود انسانی اور سرمائے کی بڑھوتری اور بنیادی انسانی حقوق کے حصول کو اسلامی انقلاب کی بنیاد سمجھتے ہیں ان کو یہ جان لینا چاہیے کہ ان مقاصد کے حصول کے لیے مغرب اسلامی تحریکوں سے زیادہ راسخ العقیدہ ہے اور ان مقاصد کے حصول کا احیاءِ اسلام سے کوئی لازمی تعلق نہیں۔

رالس اس بات پر زور دیتا ہے کہ معاشرتی غیر مساویانہ تقسیم دولت وقوت افراد کی اخلاقی مساوی حیثیت کی نفی نہیں کرتی گو کہ رالس کے مطابق اخلاقی مساوی حیثیت سے مراد ہے کہ ہر شخص کا یہ حق تسلیم کیا جائے کہ وہ اپنے خیر وشر کے معیارات کا خود تعین کر سکے۔ لیکن اس کے باوجود ایک لبرل معاشرے کے سرمایہ دارانہ معاشرے میں تبدیل ہو جانے کے امکانات سو فیصدی ہوتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ لبرل معاشرہ آزادی کے لامحدود تصور پر یقین رکھتا ہے چونکہ پیداوار میں لامحدود اضافہ ممکن نہیں ہے بلکہ اس کی ایک حد ہے جب کہ سرمائے میں اضافہ کی کوئی حد نہیں ہے لہٰذا سرمایہ دارانہ عمل کی کوشش ہوتی ہے کہ معاشرے میں موجود افراد کی خواہشات کو زیادہ سے زیادہ بڑھایا جائے اور اس کے حرص وحسد کو مزید بھڑکایا جائے تاکہ وہ اپنی انفرادی آزادی کے حصول کے لیے سرمایہ کی بڑھوتری کے عمل میں شریک ہو جائے۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ لبرل معاشرے لازماً سرمایہ دارانہ معیشت کے فروغ کا ذریعہ بنتا ہے۔

حرف آخر:

مغربی تہذیبی بنیاد کے اس مختصر خاکے سے ہم اس بات کی نشان دہی کرنا چاہتے ہیں کہ اشتراکیت اور لبرلزم کا ہدف ایک ہی ہے یعنی زیادہ سے زیادہ آزادی کا حصول اشتراکیت کا دراصل لبرلزم پر اعتراض ہی یہ ہے کہ اس سیاسی، ریاستی اور معاشی سماجی ڈھانچے میں حصول آزادی ممکن نہیں لیکن روس میں اشتراکیت کی شکست سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ آزادی کے حصول کی خواہش کی تکمیل کے لیے لبرلزم اور سرمایہ داری جو سیاسی اور معاشی نظام وضع کرتے ہیں وہ ایک دوسرے کے ساتھ منسلک اور مربوط ہیں۔

ساحل مارچ ۲۰۰۷ء

اسلامی نقطۂ نگاہ سے لبرلزم اور کمیونیٹر یزم دونوں ہی نظام ہائے حیات میں کوئی اقداری فرق نہیں۔ دونوں کا مقصود انسان کو خدا بنانا ہے دونوں خواہشات کو پر کھنے اور ان کو ترتیب دینے کے لیے کوئی پیمانہ نہیں رکھتے، دونوں کا مطمح نگاہ صرف حصول دنیا ہے وہ انسان کو خود غرض، لالچی اور حاسد بناتے ہیں اور فطرت انسانی کو مسخ کرتے ہیں، روحانی ارتقاء کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ اسلامی انقلابیوں کو ان دونوں نظاموں کو مکمل طور پر تباہ کرنے کا عزم کرنا چاہیے۔

مضمون سے ہمارا مقصد یہ واضح کرنا تھا کہ تصورات کو اگر ان کے تاریخی تسلسل سے کاٹ کر دیکھا جائے تو اس بات کا شدید احتمال رہتا ہے کہ ہم ان تصورات کے اندرونی تفرقات کو بالکل نظر انداز کر دیں جو اس تصور کی زہرناکی کو ہم پر آشکارا کر ڈالنے کی صلاحیت رکھتے ہوں یا پھر ان اندرونی تفریقات میں پھنس کر رہ جائیں اور تصور کا مجموعی تاثر ہماری نظروں سے اوجھل ہو جائے مغربی تصورات کے اس تاریخی عدم تسلسل یا دوسرے معنوں میں Libreal توضیح کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم نے ان غیر اسلامی بلکہ کافرانہ اقسام [Forms] کے لیے اسلامی بنیادیں فراہم کرنا شروع کر دیں۔ مغربی تصورات مثلاً لبرلزم، قوم پرستی، انسان پرستی، اشتراکیت وغیرہ کو اگر ایک تاریخی تناظر میں ان کی سیاسی، سماجی، معاشی اور ریاستی صف بندی کو دیکھیں جو ان تصورات کے معنی و مطالب کے ادراک کے لیے ضروری اور نا میاتی طور پر منسلک ہیں تو یہ سمجھ لینا کچھ مشکل نہیں کہ ان تصورات کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔

آزادی، مساوات، فلاح انسانی، عدل وغیرہ کو اسلام کلیتاً رد نہیں کرتا لیکن ان تصورات کے معنی و مطالب اس تاریخیت میں پنہاں ہیں جو انبیاء علیہم السلام کی تاریخ سے منسلک ہیں۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ مغربی تصور برداشت [Tolerance] کو آپ اسلام کے تصور صبر کے مماثل کر لیں اور اس کی حمایت میں قرآن و حدیث کو بھی بطور دلیل پیش کر دیں لیکن یہ ان تصورات کی مجرد تفسیر ہوگی اور ان ہی علمی بنیادوں پر استوار ہوگی جو کہ غالب اکثریت کی عقلیت سے مطابقت رکھتی ہوں اس طرز فکر کا لامحالہ یہ نتیجہ نکلے گا کہ آپ اسلام کو مغربی اقسام [Forms] میں ٹھونستے چلے جائیں گے اور اس کو عین عبادت بھی سمجھتے جائیں گے، اس تناظر میں اگر ہم ۱۸۵۷ء سے لے کر آج تک اپنی جدوجہد پر نگاہ ڈالیں تو ہم پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی انقلابی تحریکیں بھی مغربی تہذیبی اثر سے محفوظ نہیں رہ سکیں اور ہم نے مغرب کی اسلام کاری کے لیے بہت سے ایسے اسلامی جواز [اسلامی علمیت کی بنیاد پر] پیش کیے جن کے سہارے جمہوریت، حقوق کی سیاست، سیکولرازم، مقننہ آئین وغیرہ جیسے کافرانہ اور خالص مغربی اقداری تصورات اسلامی سیاست کا جزو لاینفک متصور ہونے لگے اور ان کو خالص اسلامی تصورات کے یا بعض معنی میں غیر اقداری [Value Nutural] تصور کر لیا گیا۔ اس بات کا ادراک نہایت ضروری ہے کہ بنیادی طور پر غیر اسلامی اقسام [Forms] کے ذریعے غلبۂ اسلام ممکن نہیں ہو سکتا اس لیے کہ ان اقسام [Forms] کو استعمال کرنے کے نتیجے میں ایک خاص قسم کی علمیت، عقلیت، تصور کائنات، تصور انسان تشکیل پاتا ہے جو کہ لامحالہ اسلامی تصورات سے متصادم ہے۔